محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

نعیم صدیقی

(گذشتہ سے پیوستہ)

اللہ تعالےٰ نے اسی واقعے کے ذریعے متبنٰی کے بارے میں غلط تصور رائج کو بھی توڑنے کا ارادہ فرمایا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں زوجین میں سازگاری نہ ہو سکی اور اس میں وہ ذہنی تفاوت موثر ہوا جو بطور امر واقعہ کے فریقین میں موجود تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایات آنے لگیں لیکن معاملات سلجھنے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر زیدؓ طلاق دینے کا ارادہ آپؐ کے سامنے ظاہر کرنے لگے۔ اس پر آپؐ کو بڑی تشویش ہوئی کہ ایک ایسا نکاح ٹوٹ رہا ہے جو معاشرے میں ایک نئی انقلابی مثال قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ نیز اس میں خود رسول اللہ کی تحریک اور مشورے کو بڑا دخل تھا اور آپؐ ہی چونکہ زید کی طرف سے ولی تھے اس لیے آپؐ کی بڑی ذمہ داری تھی۔ آپؐ نے بار بار اس رابطے کو بچانے اور حضرت زید کو طلاق سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن آخر کار یہ ساری کوشش ناکامی کی سرحد کو آپہنچی ہوگی اور جس طرح کی شکایات پیدا ہوں گی ان کے ازالے کی ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؐ خود زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ شریعت میں پوزیشن بالکل صاف تھی اور اس معاملے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن سابق جاہلی اثرات کے تحت اندیشہ تھا کہ لوگوں کو اچنبھا ہوگا اور ساتھ ہی مخالفین پروپیگنڈے کا ایک موضوع پالیں گے لیکن مرضی الٰہی یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت سے متبنّیٰ کی جو غلط پوزیشن چلی آرہی تھی اس کی نفی خود آپؐ ہی کے ذریعے پوری ہدایت و صراحت سے کر دی جائے تاکہ اس رسمیت کی جڑ بالکل کٹ جائے۔ قرآن میں اللہ تعالےٰ نے آپؐ کے مخفی خیال اور تفکر کو اٹھا کر برسرِ عام

رکھ دیا۔ فرمایا وَتُخْفِی فِی نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ (احزاب۔ ۳۷) انداز تنبیہ کا ہے تم اپنے دل کے پردۂ خفا میں وہ بات لیے ہوتے ہو جسے اللہ کھول دینے والا ہے ...... اور تم لوگوں سے اندیشہ کرتے ہو، یعنی ایک بات جو خدا کی شریعت میں روا ہے اسے لوگوں کے جاہلی تصورات کے اندیشے سے دل میں چھپائے رکھنا اللہ کو ناپسند ہے۔ اسے سامنے آنا چاہیئے اور اس کو واقع ہونا چاہیے۔ تاکہ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا (ایضاً۔ ۳۷) مقصود اس سے یہ تھا کہ منہ بولے بیٹوں کے بارے میں وہ غلط قید جو لگی چلی آرہی ہے وہ مسلمانوں کے اوپر سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ اسی زنجیر جاہلیت کو کاٹنے کے لیے بھرپور ضرب لگانے کی یہ شکل اختیار کی گئی کہ حضورؐ سے حضرت زینب کا رشتۂ نکاح خود اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص قائم فرما دیا۔

بس اس واقعہ کا ہونا تھا کہ مدینہ کے دشمنانِ حق کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ لوگ پروپیگنڈا کرنے لگے کہ دیکھا، یہ مذہبیت و تقدس کا ڈھونگ! منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی رچائی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیب داستاں کے لیے افسانے بھی گھڑ لیے گئے۔ منہ پھٹ یہود اور منافقین نے یہ چرچا کیا کہ (نعوذ باللہ) اصل میں تو بہو پر عاشق ہو گئے تھے۔ اسی لیے طلاق دلوائی اور پھر نکاح گانٹھ لیا۔ نکاح بھی ایسا ویسا نہیں آسمانی[۵]

---

[۵] واضح رہے کہ زمانۂ حال کے متعصب مستشرقین نے تاریخ کے اوراق سے وہ سارا گندا مواد چن چن کے علم و تحقیق کے دامن میں بھر لیا ہے جو تحریک اسلامی کے معاندین نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ خود یہ واقعہ بھی ان اصحابِ دانش و تحقیق کے ہاں ایک مقبول ترین موضوعِ بحث بنا اور اس کو خوب نمک مرچ لگا لگا کر کتابوں کے اوراق پر پھیلا دیا گیا۔ ایک گھٹیا اور بازاری قسم کا افسانہ مکمل کر کے سامنے لایا جاتا ہے جس کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ حضور کی نگاہ اتفاقاً زینب پر پڑ گئی اور جذبات بے قابو ہو گئے! ذرا سوچو کہ وہ شخص جو بے داغ جوانی کو لیے ہوئے ہر وقت مصروف رکھنے والی جدوجہد میں ساری عمر منہمک رہا اور جسے چین کا سانس لینا کبھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا کردار عین پختگی کے نقطے پر پہنچ کر بس یہی کچھ رہ گیا تھا کہ اس کا دل اس کی آنکھوں کی پلکوں پر دھرا ہوا ہو۔ کیا یہ الزام اس کے مجموعی کردار میں کھپ سکتا ہے۔ پھر حضرت زینب حضور کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور بچپن سے آپ کے سامنے کھیلیں اور جوان ہوئیں، ان کا وجود کوئی نیا انکشاف نہیں تھا۔ پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آپؐ نے خود بڑے اصرار سے حضرت زید کے ساتھ اُن کا نکاح کرایا تھا اور اس نکاح میں آپ زید کی طرف سے ولی تھے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

منعقد ہوگیا۔ اس نکاح کے لیے زمین ہموار کرنے کو اپنے مطلب کی وحی بھی نازل کرالی۔ اس سے پہلے اب تک اعتقادی اور کلامی اور فقہی امور میں مخالفانہ سرگرمیاں تھیں، مگر اس واقعہ کے سلسلے میں تو صحیح معنوں میں گندا پروپیگنڈا کیا گیا ہے اور محسنِ انسانیت کے اخلاقی مرتبے پر ہلہ بولا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کسی تحریکِ تعمیر و اصلاح کے لیے سب سے زیادہ کاری وار اخلاقی پہلو ہی سے ہو سکتا ہے۔ کسی صاحبِ دعوت کے بارے میں اگر مخالفین یہ غوغا آرائی کرنے لگیں کہ وہ بندۂ ہوس ہے۔ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے لیے ہر طریقے سے کاربرآری کر سکتا ہے اور وہ کسی اخلاقی معیار کا احترام کرنے پر تیار نہیں تو اس سے بڑھ کر تعمیری کام کو نقصان پہنچانے والا حملہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں دشمنانِ حق نے کتنی گندگی اس واقعہ پر پھیلائی ہوگی، کتنی سڑاند پیدا کردی ہوگی، اور انسانیت کے سب سے بڑے خیرخواہ پر کیسی کیسی سخت کرب کی گھڑیاں گذری ہوں گی۔

یہود کا یہ پروپیگنڈا بے چارے مسلمانوں کے لیے بھی بے حد پریشانیوں کا موجب ہوا ہوگا۔ ان کو راہ چلتے چھیڑا جاتا ہوگا۔ ان پر فقرے کسے جاتے ہوں گے اور ان کو شبہات کے چکر میں ڈالا جاتا ہوگا۔ ان میں نومسلم بھی تھے جو اپنے کچے پن کی وجہ سے گھبرا اٹھتے ہوں گے۔ ان میں منافق بھی گھسے پڑے تھے۔ اور وہ اپنے من کر عجیب طرح کی دورنگی باتیں کرتے ہوں گے۔ اس حالت میں مسلمانوں کی تسکین اور تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے چند حقائق ان کے ذہن نشین کرائے۔ ان کو بتایا کہ "نبی پر کسی ایسی بات میں کوئی مضائقہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کر دیا ہو" (احزاب ـــ ۳۸) اس اقدام کا مقصد بھی واضح کر دیا کہ "مسلمانوں کے لیے منہ بولے بیٹوں سے نکاح کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے" (احزاب ۳۷) یہ اعلان بھی کر دیا کہ "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں" (احزاب ۴۰) آخر میں خود حضورؐ سے خطاب فرما کر کہا کہ "کافروں اور منافقوں کی نہ مانو اور ان کی دلآزاریوں کو بالائے طاق رکھ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو اور اللہ ہی

(بقیہ حاشیہ) حالات کی یہ ساری ترتیب کیا اس افسانہ کے لیے واقعی کوئی بنیاد فراہم کرتی ہے جسے مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈا کے محاذ کا ایک بم بنانے میں بطور مسالہ استعمال کیا تھا اور اب اسی مسالے کو دوبارہ مستشرقین اسلام کے خلاف استعمال کر رہے ہیں؟ کیا یہ باتیں عقلیت (RATIONALISM) اور تحقیق (RESEARCH) کے دعوے داروں کے اپنے معیارات پر پوری اترتی ہیں؟

کارسازی کے لیے کافی ہے۔" (احزاب ۴۸) اس سنجیدہ اسلوب سے اس مکروہ اور گندے پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا جو یہود کی طرف سے حد درجہ کی ذہنی پستی کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔

ایک اور گندے بہتان کا طوفانِ عظیم | اوپر کے واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تحریک اسلامی کے نظریہ و نصب العین پر جب کسی طرف سے بھرپور وار کرنے کا موقع نہیں ملتا تو اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا بہتر طریقہ شیطان کی نگاہ میں یہی رہ جاتا ہے کہ اس کے علم بردار کی شخصیت اور اس کی قیادتِ عظمیٰ کے دامنِ تقدس پر گندگی کے چھینٹے ڈال دئیے جائیں۔ سو ایک موقع پر اقتدار طلبی کا اور دوسرے موقع پر نفسانیت کا گھناؤنا الزام اس کے خلاف اچھال دیا گیا۔ اب یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے اور اسلامی تحریک کے قائدِ اعلیٰ کے حرم کو نشانہ بنایا جاتا ہے جو ساری امت اور ساری انسانیت کے لیے معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے مرکزی نمونہ ٹھہرایا گیا تھا۔ اسی حرم کے گرد نئی اسلامی معاشرت کا چھتہ تیار ہو رہا تھا، اور اس چھتے کو برباد کرنے کے لیے کارگر وار وہی ہو سکتا تھا جو اس کے مرکز پر کیا جائے۔ منفی تخریبی طاقت نے یہ آخری وار بھی کر ڈالا۔ اس مخالفانہ وار کی دردناک داستان واقعۂ افک کے عنوان سے قرآن، سیرت اور تاریخ کے دفتروں میں عبرت اندوزی کے لیے محفوظ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اصل واقعہ کی حقیقت سامنے لائیں، یہ بات واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اتنے گندے بہتان کا طوفانِ عظیم آخر اسلامی تحریک کے پیدا کردہ صالح معاشرے اور تربیت یافتہ نظام جماعت میں اٹھ کیسے سکا؟ کن رخنوں سے یہ طوفان تنظیم کے قلعے میں داخل ہوا اور کیسے اسے کچھ دیر کے لیے ہولناک اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کا موقع ملا۔

فتنہ آرائی کے لیے سازگار فضا | شیطان کو اسلامی نظام اجتماعیت میں تخریب و انتشار کے ہنگامے کھڑے کرنے کے لیے بہرحال ایک خاص فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فضا چاہے جماعت کے نظم و اخلاق کی کسی کوتاہی کی وجہ سے موجود ہو جائے یا حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر پائی جائے۔ بہرحال فتنہ انگیزی کی کچھ شرطیں ہیں جو پوری ہو جائیں تو شیطان کا کید کچھ گل کھلا سکتا ہے۔ نظام مثبت میں نقشے [illegible] ہوتا ہے۔ اس میں شیطان کے لیے کام کرنے کے مواقع کسی نہ کسی حد تک ضرور باقی رہتے ہیں خواہ کیسی ہی

مثالی سوسائٹی کیوں نہ موجود ہو۔ درحقیقت انسانی فطرت میں ایسی کمزوریاں موجود ہیں کہ جن کے راستے فتنہ کا سیلاب در آتا ہے۔ نبی کی پیدا کردہ جماعت کے بارے میں بھی یہ گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اس کے دائرے میں فتنے کی طاقت کو کام کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں ملے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تندرست سے تندرست آدمی بھی کبھی نزلے، زکام یا بخار میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ سے پاکیزہ معاشرہ کو بھی حالتِ مرض پیش آسکتی ہے۔ ایک زندگی سے بھرپور اچھے معاشرے سے توقع یہی کی جاسکتی ہے کہ وہ مرض کی مدافعت میں کوتاہی نہ دکھائے گا، اور حملہ آور جراثیم کو ہلاک کرکے باہر پھینک دے گا۔ مگر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس میں کوئی مرض کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔

شیطان کے لیے ایک نظامِ جماعت میں سازگار ترین فضا نجویٰ کی فضا ہوتی ہے۔ نجویٰ سرگوشی کو کہتے ہیں۔ کسی اجتماعی نظام میں نجویٰ کے اصطلاحی معنی یہ ہوتے ہیں کہ پوری جماعت کے سامنے کھلم کھلا اپنے خیالات، مشوروں، تنقیدوں اور اعتراضوں کو پیش کرنے کے بجائے متفرق افراد علیحدگی میں بیٹھ کر کھچڑی پکائیں۔ نجویٰ درحقیقت اجتماعی زندگی میں ایک برے راستے کی طرف پیش قدمی کا آغاز ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے، تبھی کھلے بندوں کام کرنے سے آدمی کتراتا ہے اور سامنے آنے سے پہلے چپ چپاتے کھچڑی پکانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی چیز آخرکار سازش کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بدقسمتی سے حضورِ اکرم کی نگرانی میں چلتی ہوئی تحریک کے اندر یہود کی سرپرستی میں منافقین نے نجویٰ کی یہ فضا پیدا کردی تھی اور یہ برابر تحریک کے قائد اور کارکنوں کو پریشان کرتی رہی۔ قرآن اس فضا کے بنانے والوں کو بھی درسِ اصلاح دیتا رہا اور اسلامی نظامِ جماعت کے کارفرماؤں کو بھی اس کے بارے میں برابر انتباہ دیتا رہا۔ وہ پکارا:

"کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں سرگوشیاں کرنے سے باز آنے کو کہا گیا تھا وہ پھر وہی حرکت کررہے ہیں جس سے انہیں روکا گیا تھا اور وہ آپس میں بدی اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی پر خفیہ مشورے کرتے پھرتے ہیں۔" (مجادلہ - ۸)

"اے ایمان والو، جب کبھی تم علیحدگی میں باہم مشورے کرو تو [illegible] اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی کے مشورے

نہ باندھو بلکہ نیکی اور تقویٰ کے لیے مشورے کرو۔" (مجادلہ ۹)

"یہ خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں تاکہ وہ ایمان لانے والوں کو پریشان کرے، حالانکہ بغیر اللہ کے اذن کے کوئی بھی چیز ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی" (مجادلہ ۱۰)

"یہ (سرگوشیاں کرنے والے) لوگ انسانوں کی نگاہ سے تو اوجھل رہ سکتے ہیں، مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ حال یہ کہ جب وہ رات کی تاریکی اور تنہائی کے پردے میں وہ ایسی کوئی بات پکاتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں ہوتی تو اس گھڑی اللہ ان کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔" (النساء ۱۰۸)

"خفیہ مشورے کے لیے کوئی تین آدمی ایسے جمع نہیں ہوتے کہ ان کے ساتھ چوتھا اللہ نہ موجود ہو اور نہ پانچ کہ جن کے ساتھ چھٹا وہ نہ ہو۔ اور نہ اس سے کم یا اس سے زیادہ تعداد کہ ان کے ساتھ وہ موجود نہ ہو — خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔" (مجادلہ ۷)

"وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم (جماعت کے فیصلوں اور قیادت کے احکام کی) اطاعت کریں گے! مگر جب (اے نبی) آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک ٹولی راتوں کو سر جوڑ کر تمہاری کہی ہوئی باتوں کے خلاف کھچڑی پکاتی ہے اور اللہ ان کے منصوبوں کو لکھ رہا ہوتا ہے۔" (النساء ۸۱)

ان آیات میں بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ اسلامی نظام جماعت اجتماعی طور پر جن طے شدہ خطوط پر چل رہا ہو اور جو اجتماعی فیصلے اور جماعتی روایات اس کے اندر کارفرما ہوں ان کی حمایت و وکالت اور ان کی پابندی و پیروی اور ان کے نفاذ و استحکام کے لیے تو علیحدگی میں افراد باہم دگر علانیہ بھی اور تنہائی میں بھی آزادانہ بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن ان سے اختلاف کرنے اور ان کو شکست دینے، ان کے خلاف بددلی پھیلانے اور اعتراضات اٹھانے اور ان کا رُخ پھیر دینے کے لیے علیحدگی میں بیٹھ کر افراد کا خفیہ مشورے اور سرگوشیاں کرنا ایک ایسا گھناؤنا گناہ ہے جو ان افراد کی سیرت و عاقبت کو تباہ کر دیتا ہے اور پورے نظام جماعت کو پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ خفیہ اختلافی سرگوشیوں کا اصل سررشتہ دار شیطان ہے جس سے اسلامی نظام جماعت کو قرآن نے خبردار کر دیا۔

خفیہ سرگوشیوں کا ایک موضوع "معصیت الرسول" بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ درحقیقت یہی مرکزی

موضوع تھا۔ مدینہ کی تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر اس امر کی تو سرے سے گنجائش نہ تھی کہ نفس تحریک اور اس کے نظریہ و نصب العین کو پروپیگنڈے کا ہدف بنایا جا سکے اور خود خدا کی نافرمانی اور اس کی کتاب سے بغاوت کا اقدام کیا جا سکے۔ منافقین کے لیے زیادہ سے زیادہ میدانِ فتنہ اتنا ہی تھا کہ تحریکِ اسلامی کی قیادت سے الجھیں اور علمبردار اول کی شخصیت کے خلاف لاوا پکاتے رہیں۔ ایک اخلاقی تحریک کے لیے تباہی کا سب سے زیادہ کارگر اور سہل ترین حربہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی بہترین شخصیت کو داغدار کر دیا جائے اس سلسلے میں یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ اقتدار طلبی اور نفسانیت کے الزامات پہلے ہی عائد کیے جا چکے تھے لیکن درحقیقت معاملہ ایک الزام یا دوسرے الزام تک محدود نہیں تھا۔ شورشہ بازی کی ایک مہم ——— اور "سرد مہم" (WHISPERING COMPAIGN) برابر چلائی جاتی رہی۔

مثلاً بعد کے دور میں جب کہ زکوٰۃ کا نظام وصول و صرف باضابطہ طور پر قائم ہو گیا۔ حضور پر ایک گھٹیا الزام یہ بھی عاید کیا گیا تھا کہ آپؐ بیت المال میں آنے والے صدقات کو من مانے طریق سے اڑا دیتے ہیں۔[1] صورتِ واقعہ یہ تھی کہ تمام اندوختوں اور کاروباری سرمایوں اور مواشی اور زرعی پیداواروں میں سے جب باضابطہ خدا کے حاجت مند بندوں کا حق لیا جانے لگا تو ڈھیروں دولت ایک مرکز پر سمٹنے اور سرکارِ دو عالم کے مبارک ہاتھوں سے بارانِ رحمت کی طرح تقسیم ہونے لگی۔ دولت کی اس بہتی گنگا کو دیکھ کر زر پرستوں کے منہ میں پانی بھر آتا اور وہ چاہتے کہ جاہلی دور کی طرح آج بھی اس گنگا سے وہی ہاتھ رنگیں جو پہلے سے مضبوط مالی حیثیت کے مالک ہیں، لیکن اسلامی تحریک کے قائم کردہ نظام معیشت نے دولت کے بہاؤ کا رُخ، غریب طبقوں کی طرف پھیر دیا تھا اور اربابِ جاہ و حشم اس انقلاب پر کڑھتے تھے۔ وہ فی نفسہٖ اسلامی نظام معیشت پر تو حملہ کر نہ سکتے تھے۔ جو ان کی جیبیں بھاری کرنے کے بجائے الٹا ان سے بزورِ قانون "زکوٰۃ" کا "جرمانہ" وصول کر رہا تھا بس دل کا بخار نکالنے کے لیے محسن انسانیتؐ کو نشانہ بناتے ان کا کہنا یہ تھا کہ دولت اپنے حامیوں اور اپنے چہیتوں میں خرچ کی جا رہی ہے اور مہاجرین کو خاص طور پر نوازا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدائی خزانے کے بل پر دوست نوازی اور کنبہ پروری ہو رہی ہے۔

---

[1] وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ۔ القرآن: سورۂ توبہ

متفرق گفتگوؤں میں مسالہ لگا لگا کر کہا جاتا ہوگا عام لوگوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی خدا کے نام پہ نچوڑی جاتی ہے لیکن اسے اپنی دھاک بٹھانے اور اپنا اقتدار مسلط کرنے کے لیے بے دردی سے استعمال کیا جارہا ہے۔ پبلک فنڈز کے بارے میں کسی بھی نظام میں قیادت پر الزام لگ جائے تو سنگین ہوتا ہے، لیکن خاص طور پر ایک دینی و اخلاقی نظامِ معاشرہ میں جہاں خزانہ اللہ کا مال کہلاتا ہو اور جس کا ہر آمد و صرف اللہ کے نام سے ... اور اس کے احکام کے تحت کیا جاتا ہو وہاں ایسے الزام سے شدید جذباتی ہیجان پیدا کیا جاسکتا ہے۔

غور فرمایئے یہ الزام نمونے کی اس شخصیت پر چسپاں کیا جارہا تھا جس نے صدقہ کی آمدنی کو خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے نہیں، پورے خاندانِ بنی ہاشم کے لیے بمنزلہ حرام کے قرار دے لیا تھا۔ یہ شان بے لوثی جس کی کوئی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی، اس کے براق دامن پر بھی نہایت ادنیٰ سیرت کے لوگوں نے اٹھ کر دھبے ڈال دیئے۔

پھر یہی لوگ تھے جن کی تعریف قرآن یوں کرتا ہے کہ یہ اپنی باتوں سے نبی کی ذات کو دکھ دیتے ہیں۔ دینی تحریک کے اجتماعی مسائل پر صاف دلی سے کھلی فضا میں بات کرنے کے بجائے، یہ اس کے علم بردار کی شخصیت کو نشتر لگاتے رہتے تھے۔ اس نشتر زنی کی ایک مثال قرآن نے خود ہی بیان کردی ہے۔ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ اسلامی نظام جماعت میں منافقین کی حرکات و سکنات ایک ایسی بے جوڑ چیز تھیں کہ ان کی بو اہلِ ایمان کی فطرتِ صالحہ کو ناگوار گزرتی تھی اور وہ مضطرب ہو ہو جاتے تھے۔ اس پر مشکل یہ تھی کہ منافقین کی پراسرار حرکات پر قانون اور نظم کے تقاضوں کے تحت باقاعدہ گرفت کرنا بھی مشکل اور ان پر دم سادھے رہنا بھی مشکل! اہلِ ایمان بیچارے جماعتی ذمہ داری کے تقاضے سے مجبور ہو کر اہلِ نفاق کی بغیر صحت مندانہ حرکات سے حضور پاکؐ کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ہر نفاق زدہ آدمی آہستہ آہستہ جماعت میں پہچان لیا جاتا، اور اس کے بارے میں علم بردارِ تحریک کی شخصیت ایک خاص طرح کا ردِ عمل دکھاتی جو انتہائی نرمی کے اسلوب سے آہستہ آہستہ سختی کے انداز میں بدلتا گیا۔ ان حالات میں مریضانِ نفاق اپنے آپ کو ذلیل پاکر چرچا کرنے لگے کہ "هُوَ اُذُنٌ" (توبہ ۶۱) یعنی نعوذ باللہ، یہ شخص تو کان کا کچا ہے، معمولی سے معمولی مرتبے کے آدمی، جن کی ہمارے مقابل میں کوئی ہستی ہی نہیں، جانتے ہیں اور جس کے بارے میں جو بات چاہیں کہہ آتے ہیں۔

اور وہاں ہر چیز پر یقین بھی فوراً کر لیا جاتا ہے۔ میر کارواں کی اس کمزوری کی وجہ سے ہم مارے جاتے ہیں۔ اب ہم تو ٹھہرے منافق اور سازشی، اور کل کے بے حیثیت لونڈے اور رفاقتوں مارے غلام ہو گئے مقربین خاص!

کچھ ایسے ہی حالات کا ردِ عمل ہوگا کہ ایک دفعہ منافقین نے تحریک کے علمبردار اول سے علیحدگی میں وقت لینے اور گفتگوئیں کرنے کا ایک چکر چلا دیا۔ مجلس آراستہ ہے، ایک منافق صاحب بیچ میں بول اٹھتے ہیں کہ مجھے ذرا علیحدگی میں خاص بات کرنی ہے۔ حضورؐ بر بنائے مروت اس کا موقع ہر کسی کے لیے کھلا رکھتے تھے، لیکن علیحدگی میں خاص باتیں کرنے اور وقت لینے کا یہ ڈرامائی سلسلہ کسی اور غرض سے تھا، اس سے منافقین کا مدعا یہ تھا کہ ایک تو جماعت پر اپنی دھاک جمائیں کہ ہم خاص الخاص لوگ ہیں صرف اوپر کے دائرے میں ذمہ دار ترین ہستی سے خاص باتیں کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ حضورؐ کی نگاہ میں مصنوعی طریق سے تقرب و اعتبار حاصل کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اہل اخلاص کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کر کے اُس ذلت کا اپاؤ نکالا جائے جس میں اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے یہ حضرات گھر گئے تھے لیکن حضورؐ کی مروت نے منافقین کو جس تضیعِ اوقات کا کھلا موقع دے دیا تھا اسے فرمانروائے حقیقی نے یہ حکم دے کر ختم کر دیا کہ:

• اے ایمان والو! جب تم پیغمبر سے (خاص وقت لے کر) علیحدگی میں بات کرو تو ہر گفتگو ئے خاص سے قبل صدقہ پیش کرو۔ (مجادلہ - ۱۲)

اس حکم سے بخل کے مارے ہوئے منافقین کی کمر ٹوٹ گئی اور یہ خاص وقت لینے اور علیحدگی میں بات کرنے کا سلسلہ رک گیا، تاہم یہ شروع اسی تصور سے کیا گیا تھا کہ عنان بردارِ تحریک کان کا کچا (خاک بر سرِ الشیاں) ہے سوالِ اخلاص کے مقابلے میں کیوں نہ ہم بھی کان بھر کر اسے اپنی رَو میں بہالے جائیں۔ بگران کو اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اہلِ اخلاص کے لیے کان جتنے نرم تھے، اہل فتنہ کے لیے اتنے ہی ثقیل بھی تھے۔ بہرحال اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کے اندر رہ کر اس کے عنان بردار اعلیٰ کے خلاف ایسی تحقیر آمیز باتیں کرتے پھرتے ہوں گے —— ان میں نظم سے وہ محبت و وابستگی باقی کیسے رہ سکتی تھی جو کسی جماعت کے کارکنوں کو فعال اور متحرک بناتی ہے۔ ایک دینی و اخلاقی نظام جماعت میں تو جو عنصر اس کے نظام امر و قیادت کے خلاف

تحقیر کا طوفان اٹھاتا ہے اور سرگوشیوں کی مہم چلاتا ہے وہ درحقیقت سرے سے اس کی حرکت، اس کے اقدام اور اس کی فعالیت کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

تحریک جب دعوت کے مرحلے سے جہاد کے مرحلے کی طرف ایک انقلابی موڑ مڑی تھی اسی وقت ایک بڑی تعداد کا نفاق ابھر آیا تھا۔ تحریکوں کے ایسے موڑ بہت سے لوگوں کو چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر توازن صرف وہی کارکن برقرار رکھ سکتے ہیں جو پہلے سے سمجھ کر چلے ہوں کہ ہم جا کدھر رہے ہیں اور کیا کیا منازل راہ میں پڑیں گی۔ ورنہ دنیا بھر کی تحریکوں کو جب کوئی ایسا بڑا موڑ پیش آتا ہے اور وہ جست لگا کر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں تو اس تغیر کا صحیح فہم نہ رکھنے والا ضرور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ عنصر ایسے ہی تاریخی مواقع پر بسا اوقات اچھے خاصے متحرک افراد ذہنی الجھنوں میں پڑ کر بددلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی تحریک اسلامی کے ساتھ بھی ہوا۔ تحریک دعوت سے جہاد کے مرحلے میں داخل ہوئی تو کچھ لوگ اپنا فکری توازن کھو بیٹھے اور خاص طور پر وہ عنصر تو ہمیشہ کے لیے نفاق کا شکار ہو گیا جو "جہاد" کی گراں بار ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے آمادگی نہیں رکھتا تھا اور پہلے سے ذہن و فکر کو اس مرحلے کے لیے تیار کر کے نہیں لایا تھا۔

قرآن میں مذکور ہے کہ کچھ لوگ تھے جن کو جب پہلے دور میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ "کفوا ایدیکم" یعنی دعوت حق پہنچاتے ہوئے ظلم و زیادتی کو خموشی سے برداشت کرو اور ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بس اقامت نماز اور ایتائے زکوٰۃ جیسی سرگرمیوں میں منہمک رہو۔ (النساء ۷۷) لیکن ان کو اس دور میں یہ حکم ناگوار تھا بعد کے مرحلے میں جب انہی لوگوں کو "جہاد" کا حکم سنایا گیا تو وہ انسانی قوتوں سے خوفزدہ ہو کر ٹھٹک سے گئے۔ ان کا ذہنی ردِ عمل یہ تھا کہ رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ؟ (اے ہمارے رب! تو نے جہاد کا حکم ہمارے سر کیوں ڈال دیا؟ ابھی ہم اور دعوت دیتے، نماز و زکوٰۃ کے ذریعے فلاح سیرت کرتے، چندے اور تعمیری سرگرمیاں جاری رکھتے، ایک مرحلہ کے تقاضے پورے نہیں ہوئے کہ وقت سے پہلے نئی ذمہ داریاں لاد دی گئیں ہیں۔

مگر یہ لوگ سامنے سے نہ بحث کر سکتے تھے نہ اس کے احکام کے آگے کوئی بند کھڑا کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے تو [illegible] رسول کی ذات تھی، چنانچہ اس ذات اور اس شخصیت کو اصولوں نے آخر دم تک نہ بخشا۔ یہ ہر معرکۂ جہاد سے کنی کاٹتے رہے اور ہر نازک موقع پہ طرح طرح کی باتیں گھڑتے رہے۔ انھوں نے خدا کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا

انتقام ان کے دین کی تحریک چلانے والے علمبردارِ حق سے دل کھول کر لیا۔

تحریکیں جب معرکہ آرا ہوتی ہیں تو ان کے علمبردار مخالف طاقت کو جہاں ضربیں لگاتے ہیں وہاں ان کے ہاتھوں چوٹوں پہ چوٹیں کھاتے بھی ہیں۔ تدابیر کے تیر نشانے پہ لگتے بھی ہیں اور اچٹ بھی جاتے ہیں، نتائج امیدوں کے مطابق بھی نکلتے ہیں اور خلاف بھی نکل آتے ہیں۔ ایسا تو کوئی بھی میدانِ کارزار نہیں پایا گیا جس میں ہر نقصان ایک ہی فریق کے حصے میں آئے اور ہر فائدہ دوسرے فریق کے حصے میں رہے، جو فریق آخری فتح بھی حاصل کرتا ہے وہ بھی بہت سی جانیں فتح کی قیمت میں پیش کرتا ہے۔ بہت سے زخم کھاتا ہے، بہت سا مال جنگ کی آگ میں جھونکتا ہے، لیکن مدینہ کی اسلامی تحریک کے اندر کام کرنے والے منافقین اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کے اس فلسفۂ ربانی سے خالی الذہن ہو کر ہر تکلیف اور ہر نقصان اور ہر چوٹ پر بے اختیار چلا اٹھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے تحریک کے کارپردازی کی کوتاہیٔ بصیرت کا (نعوذ باللہ) قرآن میں اس ٹھنڈے ٹھنڈے فلسفیانہ پروپیگنڈے کا واضح طور پر تذکرہ موجود ہے:

" اور اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری (مراد ہے ذاتِ رسالت مآب) بدولت ہے۔" (النساء)

یعنی تحریک کے معرکوں میں جو جو چوٹیں لگتیں، جو نقصانات پیش آتے، جو قربانیاں دینی پڑتیں، اور جن تدابیر کے نتائج حسبِ مراد نہ برآمد ہوتے ان سب کی ذمہ داری سرورِ عالم کی گردن پر ڈالی جاتی، کہ یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے۔ مطلب یہ کہ دین فی نفسہٖ برحق ہے۔ تحریک پاکیزہ، نظامِ حیات لاجواب مگر بس جن ہاتھوں میں رہنمائی ہے انھوں نے سارے کام کو عجیب چکروں میں ڈال دیا ہے۔

ذرا متقیانہ شان ملاحظہ ہو کہ اللہ سے بات بنا رکھی ہے اور فوائد اور کامیابیوں کی نسبت بڑے اہتمام سے اسی کی طرف پھیری جا رہی ہے۔ گویا پروپیگنڈا فلسفیانہ ہی نہیں بڑا متقیانہ بھی تھا۔ مگر یہ منافقانہ شانِ اتقا جو رسول جیسے سربراہ کارِ تحریک کی خیرخواہی و اطاعت کا اتنا بھی حق ادا نہ کر سکی جتنا اسلام نے ایک حبشی غلام تک کی امارت کے لیے طلب کیا ہے اور جو خدا کے رسول اور تحریکِ اسلامی کے بہترین عناں بردار سے بالا بالا خدا سے رشتۂ قرابت جوڑ رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے بڑھ کر خود فریبی کی اور کونسی شکل ہوگی جو انسان نے اپنی تباہی کے لیے ایجاد کی ہو۔

اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "حسنات" کی جو نسبت وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے وہ بربنائے شکر و اعتراف نہ تھی، بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ حالات کے اندر جو اچھے پہلو ابھر آتے ہیں اور معرکہ آرائیوں سے جو مفید نتائج برآمد ہو جاتے ہیں ان میں محسن انسانیتؐ کی قیادت اور بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پیدا کردہ اتفاقات ہیں[ؔ]۔

مدینہ کی تحریکِ اسلامی کے قائد اعلیٰ کو کن ذہنی احوال سے گذرنا پڑتا ہوگا جب کہ ہر موقعِ تکلیف پر گھر کے اندر مخالفانہ تبصرہ کرنے اور ہنسی اڑانے اور تحقیر کرنے والے نام نہاد ساتھی موجود ہوں۔ بات بات پر کہتے پھرتے ہوں کہ اس عناں بردار تحریک کے ہاتھوں اب یہ مصیبت آپڑی اب وہ زخم لگا، اب ادھر سے تباہی آپڑی ہر اہم اقدام کے نتائج نکل آنے کے بعد پنڈت بن کر بیٹھ جاتے ہوں اور تبصرے کرتے ہوں کہ یوں نہ کیا جاتا اور ووں کیا جاتا۔

اسی سڑے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ ہر معرکہ کے سامنے آنے پر یاوہ گوئی کرنے لگ جاتے۔ مثلاً کہتے، کہ "ہمیں اندیشہ یہ ہے کہ حالات کا کوئی چکر ہمیں اپنی لپیٹ میں نہ لے لے" (المائدہ ۵۲) مراد یہ ہوتی تھی کہ اس تحریک کی گاڑی کو جس ڈھب سے چلایا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ اب کسی چٹان سے ٹکرائی اور اب کسی کھڈ میں گری! — آخر ہم کیوں مفت میں اپنے آپ سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

جنگِ احد کے موقع پر یہی ذہنیت تھی جس نے حسرت ظاہر کی تھی کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا "یعنی "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے" (تفہیم القرآن) سورہ آل عمران آیت ۱۵۴) اس ذہنیت میں آنحضورؐ کی قیادت و بصیرت کے خلاف صریح بے اعتمادی موجود تھی۔ یہ اپنی جگہ عقلِ کل تھے اور جو شخص کئی برس سے وحی الٰہی کی روشنی میں تحریک چلاتا آرہا تھا وہ پیغمبر ہونے کے باوجود ان کی نگاہ میں کچھ نہ تھا۔ اگر کہیں معاملہ کسی پیرو نبوت کی قیادت کا ہوتا تو خدا جانے بصیرت کے ان ٹھیکے داروں کے

ؔ اس موقع پر یہ بتا دینا مفید ہوگا کہ صاحب "موضح القرآن" نے اپنے حاشیہ میں بالکل یہی بات یوں ارشاد فرمائی ہے کہ "یہ منافقوں کا ذکر ہے کہ اگر تدبیر جنگ درست آئی اور فتح و غنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی، یعنی اتفاقاً ان کی حضرت کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے، اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے حضرت کی تدبیر کا"۔ ملاحظہ ہو حمائل شریف مطبوعہ تاج کمپنی قسم ۳۵

ہاتھوں اس کی کیا گت بنی ہوتی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ تحریک کی براہِ راست مخالفت کے بجائے سرورِ عالم کی شخصیت کو ہدف بناکر بالواسطہ حملے کا کامیاب ترین اسلوب اختیار کیا گیا تھا۔ تحریک کے میرِ کارواں ہی کے خلاف اعتراضات، تحقیر اور بیہودہ حرف گیری کا لاوہ نجویٰ کے ناپاک ماحول میں پکایا جاتا اور اس کی نافرمانی اور اس سے سرکشی کرنے کے لیے نت نئے اقدامات زیرِ غور لائے جاتے۔

اخلاقی نظامِ جماعت کی پیچیدگیاں | یہ فضا شیطان کے لیے کام کرنے کا بہترین اور وسیع میدان اپنے اندر رکھتی تھی۔ خاص طور پر اس کے دو پہلو فتنہ پردازوں کے حق میں جاتے تھے۔ تحریکِ اسلامی کا جماعتی نظام اخلاقی نظام تھا۔ اخلاقی نظام کی ایک خاص پیچیدگی یہ ہے کہ اس میں صریح قابلِ گرفت واقعات جب تک ثابت شدہ حقائق کی شکل اختیار کرکے سامنے نہ آجائیں ان پر نہ جماعت گرفت کرسکتی ہے اور نہ خرابی محسوس کرنے والے افراد حالات کے دھندلے پس منظر کو آخری نتائج نکلنے سے قبل برسرِ عام لاسکتے ہیں۔ اسلام کا اخلاقی نظامِ جماعت اپنے افراد کو ایک دوسرے کے بارے میں سوئے ظن سے روکتا ہے اور ایک مخلص آدمی آخری حد تک مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مشتبہ طرزِ عمل کے ہر جز کی بہتر سے بہتر تاویل کرتا رہے اور پھر اگر وہ غیر مخلصانہ سلسلہ احوال کی بے شمار کڑیوں کے مل جانے پر اپنے ذہن کی گہرائی میں کوئی بری رائے قائم کر بھی لے تو بھی زیادہ سے زیادہ وقفہ اس انتظار میں گزرے کہ شاید اس کے سوئے ظن کی تردید کرنے والی کوئی واضح حقیقت سامنے آجائے۔

محض تاثرات — چاہے وہ اس کی اپنی نگاہ میں کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں — اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو ایک مقدمہ کے طور پر باقاعدہ جماعت کے سامنے لاکر نظم کو متحرک کیا جائے۔ ان وجوہ سے مدینہ میں اہلِ اخلاص مجبور تھے کہ وہ فتنہ پسندوں کی ابتدائی سرگرمیوں کو جو نجویٰ کے دھندلکے میں چل رہی تھیں چند ناخوش آیند آثار و علائم کے سامنے آجانے پر بھی چپ چاپ دیکھتے رہیں۔ ہاں جب فتنہ کی فصل باقاعدہ برگ و بار لانے لگی تو پھر کہیں جاکر اخلاقی نظامِ جماعت ان کو موقع دیتا کہ وہ زبان کھولیں اور اجتماعی نظم کو حرکت میں لائیں۔

دوسری پیچیدگی اخلاقی نظامِ جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کے سربراہ کار کی شخصیت اور اس کے دوسرے

اہلِ حل وعقد اور اربابِ امر کی ذوات کو کوئی لپیٹ میں لے لے تو ان کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں جماعت کی انتظامی مشینری کی باگ ڈور ہوتی ہے اور جن کے ہاتھوں فتنوں کا سر کچلا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف فتنے انہی کو نشانہ بنا کر ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں کہ اگر وہ اربابِ فتنہ کا پول ساری جماعت کے سامنے پوری طرح کھلنے سے پہلے ان کے خلاف کوئی کارروائی کریں تو ان پر الزام آتا ہے کہ تنقید اور اختلاف کو دباتے ہیں اور آوازۂ حق بلند کرنے والوں کو آمرانہ طریقوں سے شکست دیتے ہیں جس طرح افراد کے معاملے میں کہا جاسکتا ہے کہ شرافت جہاں سب سے بڑی طاقت ہے، وہاں شرافت ہی سب سے بڑی کمزوری بھی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جماعتوں کے لیے اخلاقی نظام جہاں سب سے بڑی طاقت ہے، وہاں یہی اخلاقی نظام ان کی سب سے بڑی پیچیدگی بھی ہے۔ اس پیچیدگی کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ جماعت اپنے مجموعی ذہن کے لحاظ سے اتنی بیدار اور اپنے کردار کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی چیز کو اپنے اندر چلنے نہ دے۔ اس کے دائرے میں کوئی گوشِ ہوش جماعتی نظم کے خلاف سرگوشیاں سننے کے لیے تیار نہ ہو اور کوئی زبان کان میں پڑی ہوئی ہر بات کو اِدھر اُدھر پھیلانے کی جرأت نہ کرے۔ مگر اس انتہائی معیار تک عملاً جماعت کی جماعت کا پہنچنا اور ہر آن اس پر قائم رہنا مشکل ہے، گھٹیا باتیں سوچنے والے دماغوں، ان کو پھیلانے والی زبانوں اور ان کو سننے والے کانوں سے کوئی انسانی معاشرہ بالکل ہی پاک نہیں ہوسکتا۔ انسانی فکر، نطق اور سماعت میں سے شیطان کچھ نہ کچھ حصہ لے ہی اڑتا ہے۔

منافقین نے اخلاقی نظام کی اس ڈھیل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، لیکن انجام کار کے لحاظ سے وہ اس کی زبردست طاقت کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ان کے پورے کارنامے کا خلاصہ قرآن کی زبان میں بس یہ تھا۔ " ھَمُّوا بِمَا لَمْ یَنَالُوا " وہ جس مقصود کی طرف لپکے تھے اس تک رسائی حاصل نہ کرسکے۔ مگر جماعت کو پریشان تو کیا اسے اضطراب میں تو ڈالے رکھا۔

نجوی کی اس سازگار فضا میں جس میں تحریک کے علمبردار اولین کی ذات ہدف بنی چلی آرہی تھی اور یکے بعد دیگرے اس کے خلاف نادک اندازیاں ہو رہی تھیں، ناپاک سے ناپاک بہتان کے کسی طوفانِ عظیم کا اٹھا دینا ہرگز ناممکن نہ تھا، بشرطیکہ کوئی اچھا موقع قسمت سے فتنہ پردازوں کے ہاتھ آجائے شیطان کو اس فضا سے فائدہ اٹھانے

اور منافقین کے گروہ کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کے لیے دوسری ضرورت ایک فعال کردار کی تھی جس کا ذہن شرارت اٹھانے کے لحاظ سے موجدانہ اور تخلیقی ہو اور جسے نجومی کے پیدا کردہ بارود کے ڈھیر میں بلی چالو کی طرح ایک چنگاری اٹھا پھینکنے کی مہارت حاصل ہو۔ سو اس طرح کا فعال کردار عبداللہ بن ابی کی صورت میں پہلے ہی موجود تھا۔ اس شخص کے اندر اپنی شخصیت اور اہمیت کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ـــــ آخر ہجرت سے پہلے مدینہ کی بادشاہت کا تاج اسی کے سر پر تو رکھے جانے کے لیے زیر تیاری تھا! لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس کی تمناؤں کے راستے میں روک بن گیا۔ بادشاہت تو دور رہی، اسے اپنے کردار کے سبب تحریک اسلامی کے دائرے میں آکر مرتبۂ اولیں تو کجا، مرتبہ ثانی و ثالث تک بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس حادثے نے اس کے ذہن میں بڑا تلخ اور زہریلا ردِ عمل پیدا کر دیا اور یہ ردِ عمل ہر آن ایک نہ ایک نئے فتنے کی شکل میں مدوجزر پیدا کرتا رہتا تھا۔ شیطان انسانوں میں براہِ راست تو بہت ہی تھوڑا کام کرتا ہے اسے آلہ ہائے کار کے طور پر شیاطین الانس کی ضرورت ہوتی ہے اور شیاطین الانس کو فی سبیل اللہ فساد میں متحرک رکھنے کے لیے وہ ان کے اوپر کوئی سرخیل چاہتا ہے۔ کوئی امام فتنہ! یہ امام فتنہ اسے مدینہ میں بنا بنایا ہاتھ آگیا۔ اور تھا بھی وہ تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر! یہ ایک شخصیت ایک پیغمبر کی قیادت میں چلنے والی تحریک پر بظاہر آمنا وصدقنا بھی کہہ چکی تھی اور دوسری طرف اسی پیغمبر کی ذات اور اس کے مشن کے ساتھ ہر پہلو سے بھڑ بھی رہی تھی۔

انانیت (SELF IMPORTANCE) کے زیر اثر اس فعال کردار نے بڑے تاریخی موقع پر اپنے جذبۂ حسد کے بھڑکتے آتش دان میں سے چنگاری اٹھا کر حرم نبوی میں ڈال دی اور آناً فاناً سارا معاشرہ ذہنی حیثیت سے بھڑ بھڑ جلنے لگا۔

(باقی آئندہ)